

مَقَالَات

اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر

(۲)

میں اپنی تلاش و تحقیق سے جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ اخلاق کے لیے صرف ایک ہی بنیاد صحیح ہے اور وہ اسلام فراہم کرتا ہے۔ یہاں فلسفہ اخلاق کے تمام بنیادی سوالات کا جواب ہم کو ملتا ہے اور ایسا جواب ملتا ہے جس کے اندر وہ کمزوریاں موجود نہیں ہیں جو فلسفیانہ جوابات میں پائی جاتی ہیں۔ یہاں مذہبی اخلاقیات کی ان کمزوریوں میں سے بھی کوئی کمزوری موجود نہیں ہے جن کی وجہ سے وہ نہ کسی مستحکم سیرت کی تعمیر کر سکتے ہیں اور نہ انسان کو تمدن کی وسیع ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل بناتے ہیں۔ یہاں ایک ایسی ہمہ گیر اخلاقی رہنمائی ملتی ہے جو زندگی کے تمام شعبوں میں ترقی کے انتہائی ممکن درجات تک ہمیں لے جاسکتی ہے۔ یہاں وہ اخلاقی اصول ہم کو ملتے ہیں جن پر ایک صالح ترین نظام تمدن قائم ہو سکتا ہے اور اگر ان اصولوں پر انفرادی و اجتماعی کردار کی بنا رکھی جائے تو انسانی زندگی اُس نساد سے محفوظ رہ سکتی ہے جس سے وہ اس وقت دوچار ہے۔ اس نتیجہ پر میں کن دلائل سے پہنچا ہوں؟ اس کی مختصر تشریح میں آپ کے سامنے بیان کروں گا۔

فلسفہ جس مقام سے اپنی اخلاقی بحث شروع کرتا ہے، درحقیقت وہ اخلاق کے مسئلے کا سرا نہیں ہے بلکہ بیچ کے چند نقطے ہیں جنہیں سرے کو چھوڑ کر اس نے نقطہ آغاز بنا لیا ہے اور یہی اس کی پہلی غلطی ہے۔ یہ سوال کہ انسان کے لیے کردار کی صحت و غلطی کا معیار کیا ہے اور وہ کونسی بھلائی ہے جس کو پہنچنے کی سعی انسان کے لیے مقصود بالذات ہونی چاہیے، دراصل یہ بعد کا سوال ہے، اس سے پہلے

جو سوال حل ہونا چاہیے وہ یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان کی حیثیت کیا ہے۔ یہ سوال اس لیے تمام سوالات پر مقدم ہے کہ حیثیت کے تعین کے بغیر اخلاق کا سوال محض بے معنی ہی نہیں ہو جاتا بلکہ اس میں پیشتر امر کا اسی امر کا ہوتا ہے کہ اس طرح جو اخلاقیات متعین کیے جائیں گے وہ بنیادی طور پر غلط ہوں گے۔ مثلاً کسی جائیداد کے متعلق آپ کو یہ طے کرنا ہے کہ اس میں کس طرح مجھے کام کرنا چاہیے اور کس قسم کے تصرفات میرے لیے حق ہیں اور کس قسم کے تصرفات باطل۔ کیا آپ اس سوال کو صحیح طور پر حل کر سکتے ہیں تا وقتیکہ پہلے اس بات کا تعین نہ کر لیں کہ اس جائیداد میں آپ کی حیثیت کیا ہے اور اس سے آپ کے تعلق کی کیا نوعیت ہو؟ اگر یہ جائیداد کسی دوسرے کی ملکیت ہے اور آپ اس میں امین کی حیثیت رکھتے ہیں تو آپ کے لیے اس میں اخلاقی طرز عمل کی نوعیت کچھ اور ہوگی اور اگر آپ خود اس کے مالک ہیں اور اس پر آپ کے مالکانہ اختیار باقی غیر محدود ہیں تو آپ کے اخلاقی طرز عمل کی نوعیت بالکل دوسری ہو جائے گی۔ اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ حیثیت کا سوال اخلاقی طرز عمل کی نوعیت کے معاملہ میں فیصلہ کن ہے، بلکہ درحقیقت اسی پر اسی پر اس امر کے فیصلہ کا بھی انحصار ہے کہ اس جائیداد میں آپ کے لیے صحیح طرز عمل متعین کرنے کا حق کون ہے، آپ خود یا اللہ کے آپ امین ہیں۔

اسلام سب سے پہلے اسی سوال کی طرف توجہ کرتا ہے اور ہمیں بالکل واضح طور پر پرستشائے اشتباہ کے بغیر بتاتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کی حیثیت خدا کے بندے اور نائب کی ہے یہاں انسان کو جتنی چیزوں سے سابقہ پیش آتا ہے، وہ سب خدا کی ملکیت ہیں، حتیٰ کہ انسان کا اپنا جسم اور وہ تمام توہیں بھی جو اس جسم میں بھری ہوئی ہیں، انسان کی اپنی ملکیت نہیں بلکہ خدا کی بلکہ ہیں۔ خدا نے اس کو ان تمام چیزوں پر تصرف کرنے کے اختیارات دے کر یہاں اپنے نائب کی حیثیت سے مامور کیا ہے، اور اس ماموریت میں اس کا امتحان ہے۔ امتحان کا آخری نتیجہ اس دنیا میں نہیں نکلے گا بلکہ جب افراد کا، قوموں کا اور پوری نوع انسانی کا کام ختم ہو چکے گا اور انسانوں کی مساعی کے اثرات و نتائج پایہ تکمیل کو

پہنچ جائیں گے، تب خدا بیک وقت ان سب کا حساب لے گا اور اس امر کا فیصلہ کرے گا کہ کس نے اس کی بندگی اور نیابت کا حق ٹھیک ٹھیک ادا کیا ہے اور کس نے نہیں کیا۔ یہ امتحان کسی ایک امر میں نہیں بلکہ تمام امور میں ہے۔ کسی ایک شعبہ زندگی میں نہیں بلکہ بحیثیت مجموعی پوری زندگی میں ہے۔ نفس جسم کی جتنی قوتیں انسان کو دی گئی ہیں، سب کا امتحان ہے۔ اور فارغ میں جن جن چیزوں پر جس جس طرح کے اختیارات اے عطا کیے گئے ہیں، ان سب میں بھی امتحان ہے کہ وہ کس طرح ان پر اپنا اختیار استعمال کرتا ہے۔

حیثیت کے اس تعین کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ دنیا میں اپنے لیے اخلاقی طرز عمل کے تعین کا حق ہی سرے سے انسان کو حاصل نہیں رہتا بلکہ اس کا فیصلہ کرنا خدا کا حق ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد فلسفہ اخلاق کے وہ تمام سوالات جن کو فلسفیوں نے چھیڑا ہے، نہ صرف یہ کہ حل ہو جاتے ہیں بلکہ اس امر کی بھی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ ایک ایک سوال کے چھتیس چھتیس جوابات ہوں اور ایک ایک جواب انسانوں کا ایک ایک گروہ اخلاق کے ایک جداگانہ رخ پر چل پڑے اور ایک ہی تمدنی و اجتماعی زندگی میں رہتے ہوئے یہ مختلف سمتوں پر چلنے والے لوگ اپنی بے راہ رویوں سے بد نظمی، انتشار اور فساد برپا کریں۔ اگر انسان کی اس حیثیت کو تسلیم کر لیا جائے جو اسلام نے قرار دی ہے تو یہ بات خود متعین ہو جاتی ہے کہ خدا کے امتحان میں کامیاب ہونا اور اس کی رضا کو پہنچانا ہی وہ بلند ترین بھلائی ہے جو مقصود بالذات ہونی چاہیے، اور کسی طرز عمل کے صحیح یا غلط ہونے کا مدار اسی امر پر ہے کہ وہ اس بھلائی کے حصول میں کہاں تک مددگار یا مانع ہوتا ہو۔ اسی طرح یہ بات بھی ہمیں سے متعین ہو جاتی ہے کہ انسان کے لیے نیک و بد، صحیح اور غلط کے علم کا اصل ماخذ خدا کی ہدایت ہے اور اس کے سوا دوسرے ذرائع علم اصل ماخذ کے مددگار تو بن سکتے ہیں مگر خود اصل ماخذ نہیں بن سکتے۔ نیز یہ کہ قانون اخلاق کے لیے اصل امضار (Sanction) خدا کی ہے اور یہ بھی کہ چھے اخلاق کی پابندی اور بڑے اخلاق سے اجتناب کے لیے اصل محرک خدا کی محبت، اس کی

رضاکمی طلب اور اس کی ناراضی کا خوف ہونا چاہیے۔

پھر نہ صرف یہ کہ اس سے فلسفہ اخلاق کے سارے اصولی سوالات حل ہو جاتے ہیں بلکہ درحقیقت اس مینا و پر جو اخلاقی سسٹم بنتا ہے اس کے اندر نہایت متوازن اور متناسب طریقے سے وہ تمام اخلاقی سسٹم اپنی اپنی موزوں جگہ پا لیتے ہیں جو فلسفہ اخلاق کے مفکرین نے تجویز کیے ہیں۔ فلسفیانہ اخلاقی نظاموں کی اصل قباحت یہ نہیں ہے کہ ان میں حقیقت صداقت کا کوئی جز بھی نہیں ہے، بلکہ ان کی اصل قباحت یہ ہے کہ انہوں نے صداقت کے ایک جز کو لے کر پوری صداقت بنا لیا ہے اس لیے جوہر کے کل بننے میں جس قدر زائد کی ضرورت پڑتی ہے اس کی تکمیل کے لیے لامحالہ انہیں باطل کے بہت سے اجزاء لینے پڑتے ہیں۔ اسلام اس کے برعکس پوری صداقت پیش کرتا ہے اور اس کل صداقت میں وہ تمام جزئی صداقتیں جذب ہو جاتی ہیں جو لوگوں کے پاس الگ الگ تھیں اور ناقص تھیں۔ یہاں خوشی کا بھی ایک مقام ہے، مگر اس سے مراد وہ خوشی و خوش حالی ہے جو خدا کے قانون کی پیروی سے اور اس کے نتیجہ میں حاصل ہو اور یہ خوشی و خوش حالی جسمانی و مادی بھی ہے، ذہنی و نفسی بھی، آرٹسٹک اور روحانی بھی۔ نیز یہ خوشی و خوش حالی فرد کی بھی ہے، جماعت کی بھی، اور تمام انسانیت کی بھی۔ ان مختلف خوشیوں میں تصادم نہیں بلکہ توافق ہے۔ یہاں کمال کا بھی ایک مقام ہے، مگر وہ کمال جو خدا کے امتحان میں سوئی صدی نمبر پانے کا مستحق ہو۔ اور یہ فرد کا، جماعت کا، قوم کا، پوری انسانیت کا اغرض سب ہی کا کمال ہے۔ صحیح اخلاقی طریقہ عمل وہ ہے جس سے ہر فرد نہ صرف خود کمال کی طرف ترقی کرے بلکہ دوسروں کی تکمیل میں بھی مددگار ہو اور کوئی کسی کی تکمیل میں مزاحم نہ ہو۔ یہاں کانت کے "قطعی واجب لاطاعت" (Categorical imperative) کو بھی پوری عزت کی جگہ مل جاتی ہے، اور اس جہاز کو وہ ٹنگر بھی بل جاتا ہے جس کے بغیر یہ فلسفہ کے دریا میں ڈنگار ہا تھا۔ جس قطعی واجب لاطاعت قانون کا ذکر کانت نے کیا ہے اور جس کی وہ خود کوئی تو ضیح نہ کر سکا، دراصل وہ خدا کا قانون ہے، خدا ہی کی طرف سے اس کی صورت معین کی گئی ہے، خدا ہی کا

قانون ہونے کی وجہ سے وہ واجباً لاطاعت ہے، اور اسی کی بے چون و چرا اطاعت کا نام شکی ہے۔ اسی طرح یہاں اخلاقی خیر و شر کے علم کا جو ماخذ ہمیں بتایا گیا ہے وہ ان دوسرے ذرائع علم کی نفی نہیں کرتا جن کی طرف فلاسفہ رجوع کرتے ہیں بلکہ ان سب کو ایک سسٹم کا جز بنا لیتا ہے۔ البتہ وہ نفی جس چیز کی کرتا ہے وہ صرف یہ بات ہے کہ انہیں یا ان میں سے کسی ایک کو اصلی اور آخری ذریعہ علم کی حیثیت سے لے لیا جائے۔ خدا کی ہدایت کے ذریعہ سے خیر و شر کا جو علم ہمیں بخشا گیا ہے وہ اصل علم ہے اور تجربی علم، قوانین حیات اور حالات جو د سے استنباط کیا ہوا علم، عقلی علم، اور وجدانی علم، یہ سب اس کے ثبوت ہیں۔ جن چیزوں کو خدا کی ہدایت خیر کہتی ہے، انسانیت کا تجربہ ان کے خیر ہونے پر شہادت دیتا ہے، قوانین حیات اس کی تصدیق کرتے ہیں، عقل اور وجدان دونوں اس پر گواہ ہیں۔ لیکن معیار صداقت خدائی ہدایت ہے نہ کہ یہ ذرائع علم انسانیت کے تاریخی تجربات، یا قوانین حیات سے اگر کوئی ایسا استنباط کیا جائے یا عقل اور وجدان سے کوئی ایسی رائے قائم کی جائے جو خدا کی ہدایت کے خلاف ہو تو اصل اعتبار خدا کی ہدایت کا کیا جائے گا نہ کہ اس استنباط یا اس رائے کا۔ ہمارے پاس علم کا ایک مستند معیار ہونے کا فائدہ ہی یہ ہے کہ ہمارے علوم میں ڈسپلن پیدا ہو اور ہم اس انارکی اور بد نظمی سے بچ جائیں جو کسی معیار کے نہ ہونے اور اعجاب کل ذی رائی ہو آئیے سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح یہاں قانون اخلاق کی پشتیبان قوت Sanction اور محرکات کا مسئلہ بھی اس طور پر حل ہوتا ہے کہ اس سے ان دوسری چیزوں کی نفی نہیں ہوتی جو فلسفوں نے تجویز کی ہیں بلکہ صرف ان کی تصحیح ہو جاتی ہے اور جن غلط حدود پر وہ پھیلا دی گئی ہیں یا خود پھیل جاتی ہیں وہاں سے ان کو ہٹا کر ایک جامع سسٹم میں ٹھیک مقام پر رکھ دیا جاتا ہے۔ خدا کا قانون اس لیے کہ وہ خدا کا قانون ہے اپنے تمام کی طاقت آپ اپنے اندر رکھتا ہے، اور یہ طاقت اس مومن کے نفس میں بھی موجود ہے جو خدا کی رضا چاہنے میں خوشی محسوس کرتا ہے اور خود اس کمال کا طالب ہے

جو خدا کی طرف بڑھنے سے حاصل ہو، نیز یہ طاقت مومنین کی سوسائٹی اور اس صلح ریاست میں بھی موجود ہے جو خدا کے قانون پر مبنی ہو۔ قانون کی پابندی پر مومن کو آمادہ کرنے والی چیز اس کی خالص فرض شناسی بھی ہے، اس کا حق کو حق جانتے ہوئے اسے پسند کرنا اور باطل کو باطل سمجھتے ہوئے اس سے نفرت کرنا بھی ہے، اور وہ طمع اور خوف بھی ہے جو وہ اپنے خدا سے رکھتا ہے۔

دیکھیے، اس طرح اسلام اس پوری فکری اور عملی انارکی کو ختم کر دیتا ہے جو انسان کو بے خدا فرض کر کے اس کے لیے ایک نظام اخلاق تجویز کرنے کی کوششوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد آچلیے۔ اسلام خدا کا جو تصور پیش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا ہی انسان کا اور ساری کائنات کا واحد مالک، خالق، معبود اور حاکم ہے۔ اس خدائی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ اس کے ہاں بجز وہ علم خیر کے کسی ایسی سفارش کی گنجائش نہیں جو زور سے منوائی جاتی ہو اور روتہ کی جاسکتی ہو۔ اس کے ہاں ہر شخص کی کامیابی و ناکامی کا مدار اس کے اپنے طرز عمل پر ہے، نہ کوئی کسی کا کفارہ بن سکتا ہے، نہ کسی کے عمل کی ذمہ داری دوسرے پر ڈالی جاتی ہے، اور نہ کسی کے عمل کا صلہ دوسرے کو ملتا ہے۔ اس کے ہاں جانبداری نہیں کہ ایک شخص یا خاندان یا قوم یا نسل سے اس کو دوسرے کی نسبت زیادہ دلچسپی ہو۔ سب انسان اس کی نگاہ میں یکساں ہیں، سب کے لیے ایک ہی قانون اخلاق ہے، اور فضیلت جو کچھ بھی ہے اخلاقی فضیلت کے اعتبار سے ہے۔ وہ خود رحیم ہے اور رحم کو پسند کرتا ہے۔ وہ خود فیاض ہے اور فیاضی کو پسند کرتا ہے۔ وہ خود غفور ہے اور درگزر کو پسند کرتا ہے۔ وہ خود عادل ہے اور عدل کو پسند کرتا ہے۔ وہ خود ظلم سے تنگ نظری و تنگ بینی سے، بے رحمی و تنگ بینی سے، تعصب اور نفسانی جانب داری سے پاک ہے اس لیے انہی کو پسند کرتا ہے جو ان صفات سے پاک ہوں۔ پھر کبریائی تمہا اسی کا حق ہے اس لیے کبر سے نا پسند ہے۔ خدائی عرفت اس کے لیے ہے اور دوسرے اس کے بندے ہیں، اس لیے ایک بندے پر دوسرے کی خداوندی اس کو پسند نہیں۔ مالک وہ کیلے ہے اور دوسروں کے

پاس جو کچھ ہے امانت کی حیثیت سے ہے، اس لیے کسی بندے کی خود مختاری، اور کسی کا کسی کے لیے
 قانون بنانا، اور کسی کا کسی کے لیے بذات خود واجب لاطاعت ہونا یہ سب فی الحقیقت غلط ہے۔
 سب کا مطاع وہی ایک ہے اور سب کے لیے خیر اسی میں ہے کہ اس کی بے چون و چرا اطاعت کریں۔
 پھر وہ محسن ہے اور شکر، احسان مندی اور محبت کا مستحق ہے۔ وہ منعم ہے اور اس کا حق دار ہے کہ اس
 کی نعمتوں میں اسی کے مشارکے مطابق تعریف کیا جائے۔ وہ منصف ہے اور لازم ہے کہ انسان
 اس کے انصاف میں سزایا نے کا خوف اور جزا پانے کی طمع رکھے وہ حلیم و خیر ہے اور دلوں کی چھپی
 ہوئی نیتوں سے بھی واقف ہے اس لیے ظاہری حسن اخلاق سے اس کو دھوکا نہیں دیا جاسکتا۔
 وہ محیط ہے اس لیے کوئی یہ امید بھی نہیں کر سکتا کہ جرم کر کے اس کی پکڑ سے بچ نکلے گا۔

خدا کے اس تصور پر غور کیجیے اس سے خود بخود ایک فطری نتیجہ کے طور پر انسان کے لیے ایک
 مکمل اخلاقی زندگی کا نقشہ وجود میں آتا ہے اور وہ نقشہ ان تمام کمزوریوں سے خالی ہے جو مشرکانہ
 مذاہب کے اخلاقیات اور ذہنی باز مسکوں کے اخلاقیات میں پائے جاتے ہیں یہاں نہ تو اخلاقی ذمہ
 داریوں سے بچ نکلنے کے لیے چور دروازے کہیں موجود ہیں، نہ ان ظالمانہ فلسفوں کے لیے کوئی جگہ
 ہے جن کی بنا پر انسان اپنی دلچسپیوں کے لحاظ سے عالم انسانیت کو تقسیم کر کے ایک حصہ کے لیے
 مجسم فرشتہ اور دوسرے حصہ کے لیے مجسم شیطان بن جاتا ہے۔ نہ دہری اخلاقیات کی وہ بنیادی
 کمزوریاں اس میں پائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے اخلاقی میں کوئی استحکام پیدا نہیں ہو سکتا۔ ان
 سبلی خوبیوں کے ساتھ اس نقشہ میں یہ ایجابی خوبی موجود ہے کہ یہ اخلاقی فضیلت کا ایک بلند ترین
 اور وسیع ترین منہا پیش کرتا ہے جس کی وسعت اور بلندی کی کوئی حد نہیں، اور اس منہا کی طرف پڑھنے
 کے لیے ایسے محرکات فراہم کرتا ہے جو پاکیزہ ترین ہیں۔

پھر یہ تصور کہ امتحان کسی ایک چیز میں نہیں بلکہ ان تمام چیزوں میں ہے جو خدا نے انسان کو

دی ہیں، کسی ایک حیثیت میں نہیں بلکہ ان تمام حیثیتوں میں ہے جو انسانوں کو یہاں حاصل ہیں، اور کسی ایک شعبہ میں نہیں بلکہ پوری زندگی میں ہے، یہ اخلاق کے دائرے کو اتنا ہی پھیلا دیتا ہے جتنا امتحان کا دائرہ پھیلا ہوا ہے۔ انسان کی عقل، اس کے ذہنی علم، اس کی ذہنی ذکری قوتیں، اس کے حواس، اس کے جذبات، اس کی خواہشات، اس کی جسمانی طاقتیں، سب کی سب امتحان میں سریک ہیں، یعنی امتحان آدمی کی پوری شخصیت کا ہے۔ پھر خارج کی دنیا میں جن جن اشیاء سے آدمی کو سابقہ پیش آتا ہے، جن اشیاء پر وہ تصرف کرتا ہے، جن انسانوں سے مختلف طور پر اس کو واسطہ پڑتا ہے، ان سب کے ساتھ اس کے برتاؤ میں امتحان ہے، اور سب کے بڑھ کر اس امر میں امتحان ہے کہ انسان یہ سب کچھ خدا کی خداوندی اور اپنی عبدیت و نیابت کے احساس کے ساتھ کر رہا ہے یا آزادی و خود مختاری کی ہوا میں مبتلا ہو کر؟ یا خدا کے سوا دوسروں کا بندہ بن کر؟ اس وسیع ترین تصور اخلاق میں وہ تنگی نہیں ہے جو مذہب کے محدود تصور سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ آدمی کو زندگی کے ہر میدان میں آگے بڑھاتا ہے، ہر میدان کی اخلاقی ذمہ داریاں اسے بتاتا ہے، اور وہ اخلاقی اصول اسے دیتا ہے جن کی پیروی کرنے سے وہ خدا کے اُس امتحان میں کامیاب ہو سکے جو ایک ایک میدان زندگی کو متعلق ہے۔

پھر یہ تصور کہ امتحان کا اصلی اور آخری فیصلہ اس زندگی میں نہیں بلکہ دوسری زندگی میں ہوگا اور حقیقی کامیابی و ناکامی وہ ہے جو وہاں ہونہ کر یہاں، یہ دنیا کی زندگی اور اس کے معاملات پر انسان کی نظر (Outlook) کو بنیادی طور پر بدل دیتا ہے۔ اس تصور کی وجہ سے وہ نتائج جو اس دنیا میں نکلتے ہیں ہمارے لیے حسن و قبح، صحت و غلطی، حق اور باطل، اور کامیابی و ناکامی کے قطعی، اصلی اور آخری معیار نہیں رہتے، اس لیے قانون اخلاق کی پیروی کرنے یا نہ کرنے کا انحصار بھی ان نتائج پر نہیں ہو سکتا جو شخص اس تصور کو قبول کرے گا وہ قانون اخلاق کی پیروی پر بہر حال

ثابت قدم رہے گا خواہ اس دنیا میں اس کا نتیجہ بظاہر اچھا ہو یا برا، کامیابی کی صورت میں نکلتا نظر آئے یا ناکامی کی صورت میں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کی نگاہ میں دنیوی نتائج بالکل ہی ناقابل لحاظ ہوں گے، بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ وہ اصلی اور آخری لحاظ ان کا نہیں بلکہ آخرت کے پائیدار نتائج کا کہے گا اور اپنے لیے صحیح صورت اس طرز عمل کو سمجھے گا جو ان نتائج پر نگاہ رکھتے ہوئے اختیار کیا جائے۔ وہ کسی چیز کو چھوڑنے اور کسی کو اختیار کرنے کا فیصلہ اس بنیاد پر نہیں کرے گا کہ زندگی کے اس ابتدائی مرحلہ میں وہ لذت اور خوشی اور نفع کی موجب ہے یا نہیں بلکہ اس بنیاد پر کرے گا کہ زندگی کے آخری مرحلہ میں اپنے قطعی و حتمی نتائج کے اعتبار سے وہ کسی ہے۔ اس طرح اس کا نظام اخلاق ترقی پذیر تو ضرور رہے گا مگر اس کے اصول اخلاق تغیر پذیر نہ ہوں گے اور نہ اس کی سیرت ہی تلون پذیر ہوگی۔ یعنی تمدن و تہذیب کے تشوونما کے ساتھ ساتھ اس کے اخلاقی تصورات میں وسعت تو یقیناً ہوگی مگر یہ ممکن نہ ہوگا کہ واقعات کی ہر کروٹ اور حالات کی ہر گردش کے ساتھ اخلاق کے اصول بھی بدلتے چلے جائیں اور آئی ایک اخلاقی گرگٹ بن کر رہ جائے کہ اس کے اخلاقی رویہ میں سرے سے کوئی پائیداری ہی نہ ہو۔

پس اخلاق کے نقطہ نظر سے آخرت کا یہ اسلامی تصور دعائم فائدے عطا کرتا ہے جو کسی دوسرے ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ ایک یہ کہ اس سے اصول اخلاق کو غایت درجہ کا استحکام نصیب ہوتا ہے جس میں تزلزل کا کوئی خطرہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس سے انسان کی اخلاقی سیرت کو وہ استقامت میسر آتی ہے جس میں (بشرط ایمان) انحراف کا کوئی اندیشہ نہیں۔ دنیا میں سچائی کے دس مختلف نتیجے نکل سکتے ہیں اور ان نتائج پر نگاہ رکھنے والا ایک ابن الوقت انسان مواقع اور امکانات کے لحاظ سے دس مختلف طرز عمل اختیار کر سکتا ہے، لیکن آخرت میں سچائی کا نتیجہ لازماً ایک ہی ہے اور اس پر نظر رکھنے والا ایک مومن انسان دنیوی فائدے اور نقصان کا لحاظ کیے بغیر لازماً ایک ہی طرز عمل اختیار کرے گا۔ دنیوی نتائج کا اعتبار کیجیے تو خیر و شر کسی متعین چیز کا نام نہیں رہتا بلکہ ایک ہی چیز اپنے مختلف نتیجوں کے لحاظ سے

کبھی خیر اور کبھی شہرت رہتی رہتی ہے افساس کے اتباع میں دنیا پرست آدمی کا کردار بھی اپنی پوزیشن تبدیل کرتا رہتا ہے، لیکن آخرت کے نتائج پر نظر رکھیے تو خیر اور شہر دونوں قطعی طور پر متعین ہو جاتے ہیں اور مومن بالآخر خیر آدمی کے لیے یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ کبھی خیر کو بد انجام یا شہر کو نیک انجام سمجھ کر اپنے کردار کو بدل دے۔

پھر یہ تصور کہ انسان اس دنیا میں خدا کا خلیفہ ہے اور تصرف کے جو اختیارات یہاں اسے حاصل ہیں وہ سب دراصل نائب خدا ہونے کی حیثیت سے ہیں، انسانی زندگی کے لیے راستے اور مقصد دونوں کا تعین کرتا ہے۔ اس تصور سے لازم آتا ہے کہ انسان کے لیے خود مختاری اور بندگی خیر اور خداوندانہ بڑائی کے تمام رویے غلط ہوں اور صرف یہی ایک رویہ صحیح ہو کہ اپنے تمام تصرفات میں وہ خدا کی مرضی کا تابع اور اس کے نازل کردہ اخلاقی قانون (Moral law) کا پابند بن کر رہے۔ نیز اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ انسان ایک طرف تو اپنے اخلاقی رویے میں ہر ایک طرز عمل سے شدتاً جتناب کرے جس میں خود مختاری و بغاوت کا، یا خدا کے سوا کسی اور کی بندگی کا، یا خداوندانہ کبریائی کا ذرہ برابر شائبہ پایا جاتا ہو، کیونکہ یہ تینوں چیزیں اس کی نائبانہ حیثیت کے منافی ہیں، مگر دوسری طرف خدا کی املاک میں اس کا تصرف اور خدا کی پیدا کردہ قوتوں میں اس کا برتاؤ اور خدا کی رعیت میں اس کی فرماں روائی اس اخلاق اور اس برتاؤ کے عین مطابق ہو جو اس سلطنت کا اصل مالک اپنے ملک اور اپنی رعیت میں اختیار کر رہا ہے، کیونکہ نائبانہ حیثیت کا فطری اقتضایہ یہ ہے کہ نائب سلطان کی پالیسی خود سلطان کی پالیسی سے اور نائب سلطان کے اخلاق خود سلطان کے اخلاق سے منافی نہ ہوں۔ نیز اس تصور سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ جو قوتیں اللہ نے انسان کو عطا کی ہیں اور جو ذرائع اور وسائل اسے دنیا میں بخشے ہیں ان سب کو استعمال کرنے اور نثار الہی کے مطابق استعمال کرنے پر انسان مامور ہو۔ ایسی دوسرے الفاظ میں نائب سلطان بھی سخت مجرم ہو جس نے

سلطان کے منشاء کے خلاف اس کی ملک اور اس کی زبیت میں تصرف کیا، اور اسی طرح وہ نائب بھی ہوا۔
 تیار پائے جس نے سلطان کے دیے ہوئے اختیارات میں سے کسی اختیار کو سرے سے استعمال ہی نہ کیا،
 اس کی بخشی ہوئی قوتوں میں سے کسی قوت کو بلاوجہ ضائع کیا، اس کے دیے ہوئے فرائض و وسائل سے
 کام لینے میں جان بوجھ کر کوتاہی کی، اور اس ڈیوٹی سے منہ موڑ کر کھڑا ہو گیا جس پر سلطان نے اسے مامور
 کیا تھا۔ نیز اس تصور سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ پوری نوع انسانی کی اجتماعی زندگی ایسے ڈھنگ پر قائم
 ہو کہ سارے انسان یعنی خدا کے سب خلیفہ ان ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں جو خدا نے ان پر عائد
 کی ہیں، ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہوں اور نظام تمدن و عمران میں ایسی کوئی چیز کارفرما نہ رہے
 جس کی وجہ سے ایک انسان دوسرے انسان کی یا انسانوں کا ایک گروہ دوسرے گروہ کی خلافت کو
 عملاً سلب کر لے یا اس کے اجزاء میں مانع و مزاحم ہو، بخراست صورت کے جبکہ کوئی انسان یا گروہ انسانی
 خلافت سے محروم ہو کر اپنے حقیقی سلطان سے بغاوت کا مرتکب ہو رہا ہو۔

یہ تو ہے وہ اخلاقی مہیاں جو تصور خلافت سے ایک لازمی نتیجہ کے طور پر انسان کے یہ نتیجے
 ہے۔ رہا انسان کی اخلاقی زندگی کا مقصد اور اس کی تمام سعی و عمل کا نصب العین، تو وہ بھی اسی تصور سے
 یا نکل ایک منطقی تروم کے ساتھ متعین ہوتا ہے۔ نائب سلطان کی حیثیت سے انسان کا زمین پر مامور ہونا
 خود بخود اس بات کا تقاضی ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد زمین پر خدا کی مرضی پوری کرنے کے سوا
 اور کچھ نہ ہو۔ خدا نے زمین کے انتظام کا جتنا حصہ انسان سے متعلق کیا ہے اس حصہ میں خدا کے
 قانون کو جاری کرنا، خدا کے منشاء کے مطابق امن اور عدل اور صلاح کا نظام قائم کرنا اور قائم رکھنا،
 اس نظام میں شرف و کی جو جو صورتیں شبیاطین جن و انس پیدا کرے ان کو دباننا اور مٹانا، اور ان
 بھلائیوں کو زیادہ سے زیادہ نشوونما دینا جو خدا کو محبوب ہیں اور جن سے خداوند عالم اپنی زمین اور اپنی حیثیت
 کو آراستہ دیکھنا چاہتا ہے، یہ ہے وہ مقصد جس پر ہر وہ انسان اپنی تمام مساعی کو مرکوز کر دے گا جس کے

اندر خلیفۃ الہی ہونے کا شعور بیدار ہو چکا ہو۔ یہ مقصد صرف یہی نہیں کہ ان تمام مقاصد کی نفی کر دیتا ہو جو لذت پرستوں اور مادہ پرستوں اور قوم پرستوں اور دوسرے جہلات کے پرستاروں نے اپنی زندگی کے لیے مقرر کیے ہیں، بلکہ یہ ان لذتی مقاصد کی بھی انتہی ہی شدت کے ساتھ نفی کرتا ہے جو روحانیت کے ایک غلط تصور کے تحت اہل مذاہب نے متعین کیے ہیں۔ ان دونوں غلط انتہاؤں کے درمیان غلط الہیہ کا تصور انسان کے سامنے ایک ایسا بلند ترین اور پاکیزہ ترین مقصد حیات رکھ دیتا ہے جو اس کی ساری قوتوں اور قابلیتوں کو زندگی کے ہر میدان میں برسر کار لاتا ہے اور انہیں ایک صراح تیز نظام تہذیب تمدن کے قیام و ارتقار کی خدمت میں استعمال کرتا ہے۔

یہ ہیں وہ بنیادیں جو اخلاق انسانی کی تعمیر کے لیے اسلام نے ہم کو دی ہیں۔ اسلام کسی ایک قوم کی جائداد نہیں بلکہ تمام انسانیت کی مشترک میراث ہے اور اسے ان لوگوں کی فلاح اس کے پیش نظر ہے اس لیے ہر اس شخص کو جو اپنی اور انسانیت کی فلاح کا خواہشمند ہو، یہ سوچنا چاہیے کہ آیا انسانی اخلاق کی تعمیر کے لیے یہ بنیادیں بہتر ہیں جو اسلام ہمیں دے رہا ہے یا وہ جو روحانی مذاہب یا فلسفیانہ مسالک ہم کو دیتے ہیں؟ اگر کسی کا دل گواہی دے کہ اخلاق کے لیے یہی بنیادیں صحیح ترین ہیں تو پھر کوئی جاہلانہ تعصب سے ان بنیادوں کے قبول کر لینے میں مانع نہ ہونا چاہیے۔

طیلاع

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی جملہ تصانیف سلیمان بک ڈیو۔ صدر بازار، کپور تھلہ
بھی مل سکتی ہیں